محمد سلمان ریاض *

ترجمے کی لسانیاتی تحقیق کی کمزوریاں اور ان کا تفاعلی حل

Abstract:

The Complexities of Linguistic Research on Translation Studies and their Functionalist Solution

Contrary to the thoughts and opinions of laymen, translation is not a straightforward process of picking up a text and converting it into another language. It was the linguistic, especially the structural upsurge of the 50s and 60s which ushered in a scientific enquiry into the process and product of translation, exposing the world to the complexities involved in it. As with every 'man-discovered' phenomenon, the linguistic approach had its drawbacks and weaknesses. The current article highlights three fundamental issues with the linguistic study of translation and seeks to introduce German functionalist approach, which successfully addressed these issues by coming up with some revolutionary ideas to the Pakistani students, practitioners, readers, researchers thinkers, and critics of translation. It is expected that a reading of the current article will help the readers think about translation in a wider and more realistic perspective, and will be useful in promoting scholarship and research in translation on

modern lines in Pakistan.

Keywords: Translation, Structural Upsurge, Linguistic Approach, German Functionalist Approach.

۱۹۵۰ء کی دہائی میں ترجمے کے سلسلے میں باقاعدہ لسانیاتی تحقیق کا آغاز ہوا اور علمِ ترجمہ کا مطالعہ ہیئتی (formalist)، ساختی (structuralist)، مابعد ساختی (post-structuralist)، تولیدی/ تخلیقی (generative) اور رد تشکیل(deconstructionists) نظریہ سازوں کی روشنی میں کیا جانے لگا، اور فنِ ترجمہ کو، جو صدیوں سے انسان کی بین اللسانی/ بین الاقوامی ضروریات کو پورا کرتا چلا آ رہا تھا، پہلی دفعہ علمی ایوانوں میں سنجیدہ سائنسی تحقیق سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ بلا شک و شبہہ علمِ ترجمہ کے ضمن میں یہ ایک انقلابی قدم تھا، جس کے ثمرات آج تک محسوس کیے جا رہے ہیں، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس تحقیقی رجحان میں چند خامیاں سامنے آتی گئیں جن میں سے حسبِ ذیل تین بنیادی نوعیت کی تھیں:

۱۔ ماخذ متن (source text) کو بنیادی اور اس کے مصنف کو بے تاج بادشاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ مترجم کے لیے ضروری تھا کہ ترجمہ اور اصل متن ہیئت اور الفاظ و فقرات کے معنی کے لحاظ سے ایک جیسے (same) یا مساوی (equivalent) ہوں۔ اس کی مثال کے لیے ترجمے کے کلیدی لسانیاتی محققین کی طرف سے پیش کی گئی ترجمے کی تعریف دیکھیے:

> The replacement of textual material in one language (SL) by equivalent textual material in another language (TL).[۱]
>
> ایک زبان کے متنی مواد کو دوسری زبان کے مساوی متنی مواد سے بدلنا
>
> A craft consisting in the attempt to replace a written message and/or statement in one language by the same message and/or statement in another language.[۲]
>
> ایک ایسا ہنر جو ایک زبان کے تحریری پیغام اور/ یا بیان کو دوسری زبان کے اسی جیسے پیغام اور/ یا بیان سے بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔
>
> Translating consists in reproducing in the receptor language the closest

natural equivalent of the source language message.[۳]

ترجمہ کاری وصول کنندہ زبان میں ماخذ زبان کے پیغام کا قدرتی لحاظ سے انتہائی مساوی پیغام پیدا کرنے کا عمل ہے۔

۲۔ مذکورہ بالا رجحان کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ ترجمے کی تحقیق کے لیے تجویزی (prescriptive) نقطۂ نظر اپنایا گیا جس کے تحت اصل متن (original text) اور اس کے مختلف تراجم کا تقابلی جائزہ (contrastive analysis) لیا جاتا تھا اور ان تراجم کے وہ لسانی عناصر جو اصل متن کے لسانی عناصر سے مختلف ہوتے، انھیں خامیاں قرار دیا جاتا اور محقق ان کے حل کے طور پر درست متبادلات تجویز کرتا تھا۔

۳۔ خامیوں کے جائزے (error analysis) کا یہ عمل اس لحاظ سے خصوصاً ناکافی اور کمزور تھا کہ اس میں محقق تقابل کے لیے جن اصولوں اور معیارات کی پیروی کرتا تھا ان کی اساس کُلی طور پر لسانیاتی تھی، یعنی ان میں محقق/ناقد بیرونی عناصر (external elements) جو ترجمے کے عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں — جیسے ثقافتی رجحانات، قارئین کی پسند و ناپسند، وغیرہ — سے مکمل صرفِ نظر کرتا تھا، جس سے ظاہر ہے کہ تنقید جزوی اور جانبدار (لہٰذا نامکمل) رہتی تھی۔[۴]

جیسے جیسے ترجمے کے محققین کو ان خامیوں اور لسانی تحقیق کی 'جزویت' کا ادراک ہوتا گیا وہ ایسے نظریات کے متلاشی ہوئے جن میں یہ کمزوریاں نہ ہوں۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں دو مختلف لیکن متعلقہ نظریات اس لسانی ڈگر کی مخالفت میں اُبھر کر سامنے آئے۔ ان میں سے ایک بعد میں توضیحی مطالعہ ترجمہ[۵] (descriptive translation studies) اور دوسرا تفاعلی رجحان برائے ترجمہ (functionalist approach to translation) کے نام سے مشہور ہوا۔ ان دونوں نے لسانیاتی تحقیق کی مذکورہ بالا خامیوں کو دور کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ چنانچہ ان دونوں میں ہمیں کافی قدریں مشترک نظر آتی ہیں، لیکن یہ چونکہ اس مضمون کا موضوع نہیں، اس لیے اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم ذیل میں تفاعلی رجحان پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔

تفاعلی رجحان یا تحقیق نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں جرمنی میں جنم لیا۔ اس کا آغاز کیتھرینا رائس (Katharina Reiss) کے کام سے ہوا، بعد ازاں اس کے شاگرد ہانس جے ورمیئر (Hans J. Vermeer) نے ایک باقاعدہ تفاعلی نظریے کی بنیاد رکھی، جسے اُس نے 'سکوپوس تھیوری' کا نام دیا (یونانی زبان کے لفظ سکوپوس کا مطلب 'مقصد' ہے)۔[۶] آنے والے سالوں میں جرمن خاتون محقق جُسٹا ہولز منٹیری (Justa Holz-Manttari) نے بھی اس تحقیق کے خدوخال وضع کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جب کہ ایک اور جرمن خاتون کرسٹیانا نارڈ (Christiane Nord) نے اس رجحان کے سقم دور کرنے

میں اپنا کردار ادا کیا۔ اپنی جدتِ نظری اور وسعتِ قلبی کی بنا پر تفاعلی تحقیق جلد ہی جرمنی میں مقبولِ عام ہوگئی۔ لسانیاتی تحقیقات کے برعکس، جن میں صرف ادبی و مذہبی کتب کے تراجم پر ہی بات کی جاتی تھی اور وہ بھی صرف تحقیقی و علمی نقطۂ نظر سے، تفاعلی محققین نے ترجمے کی تحقیق کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اسے جامعات کی چار دیواری سے نکالا اور روزمرہ زندگی میں ایک حقیقی مترجم کو پیش آنے والے حالات پر توجہ مرکوز کی۔ اس طرح سے یہ کہنا قطعاً بے جا نہ ہوگا کہ اس تحریک نے تھیوری (یعنی ترجمے کے پیچیدہ عمل کی تعریف و توضیح کرنا؛ یہ کام عموماً جامعات میں ترجمے کے پروفیسر حضرات انجام دیتے تھے اور ان کا اس حقیقت سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ جامعہ کی دنیا سے باہر عام زندگی میں ایک حقیقی مترجم کیا کرتا ہے اور اُسے ترجمے کے دوران کن حالات کا سامنا ہوتا ہے) اور پریکٹس (حقیقی دنیا میں ترجمے کا عمل اور اس پر اثرانداز بیرونی عوامل) کے درمیان لسانیاتی تحقیق کے نتیجے میں پیدا ہوئی خلیج کو پاٹنے میں تفاعلیت نے اہم کردار ادا کیا۔ ذیل میں تفاعلی تحقیق کے ان جدید تصورات کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے جنھوں نے لسانیاتی تحقیق کی مذکورہ بالا خامیوں کو دور کرنے میں اکسیر کا کام کیا۔

۱۔ تفاعلی محققین نے ترجمہ شدہ متن یا ہدفی متن[۷] (target text) کی اہمیت واضح کی۔ اس سے پہلے ماخذ متن کی حیثیت مرکزی تھی، اور ترجمہ اور مترجم محض نقل اور نقال متصور کیے جاتے تھے۔ تفاعلی محققین نے واضح کیا کہ ہدفی متن نقالی نہیں بلکہ ایک پیچیدہ تخلیقی عمل ہے جس میں مترجم کو چومکھی لڑنا پڑتی ہے: اُسے ماخذ متن کی لسانی و ثقافتی ترکیب (linguistic and cultural makeup) کے ساتھ ساتھ، بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر، ہدفی لسانی و ثقافتی اقدار کی پاسداری کرنا ہوتی ہے، ہدفی قارئین (target readers) کے ادبی ذوق اور توقعات (literary taste and expectations) پر پورا اترنا ہوتا ہے، ادب کی جمالیات (literary aesthetics) کو نظر میں رکھنا ہوتا ہے اور کلائنٹ[۸] کی توقعات کا بھرم رکھنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سیدھے سادے لیکن انقلابی تصور نے دو کارنامے انجام دیے:

واضح کیا کہ ہدفی متن نقل نہیں، بلکہ ایک ’تخلیقی‘ عمل ہے۔

مترجم، جس کی حیثیت نہ ہونے کے برابر تھی، کے اس تخلیقی عمل میں ادا کیے گئے کلیدی کردار کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

۲۔ اگرچہ تفاعلی تحقیق میں تجویزیت سے مکمل کنارہ تو نہیں کیا گیا مگر اس کا دائرہ کار وسیع کر دیا گیا۔ چنانچہ تجزیے کا میدان ’الفاظ‘ کی بجائے (ناقدین اور مترجمین کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ماخذ اور ہدفی متون کا تقابل الفاظ کی سطح پر کر کے تجویز کریں کہ کن الفاظ (اور فقرات) کا ترجمہ درست اور کس کا غلط ہے) ’مقصد‘ قرار پایا، یعنی ناقدین اور مترجمین کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ وہ اس مقصد کو سمجھیں جس کی تکمیل کے لیے کسی ہدفی متن کی ضرورت پیش آتی ہے اور ترجمے کی

کامیابی کو اس بات سے مشروط کریں کہ آیا ہدفی متن سونپے گئے مقصد کو مناسب/کافی حد تک پورا کرتا ہے یا نہیں۔[۹] اس کو سمجھنے کے لیے حسبِ ذیل مثالوں پر غور کیجیے جن سے ہمیں اپنی روز مرہ زندگی میں یا تو خود پالا پڑتا ہے یا یہ ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں:

کسی بیرونی ملک کے لیے ویزے کی درخواست دیتے ہوئے ایک طالب علم اُس ملک کی زبان میں اپنی سند کا ترجمہ (جیسے اردو سے انگریزی) کرواتا ہے۔

کوئی مذہبی ادارہ تبلیغ کی نیت سے مذہبی کتابوں (جیسے قرآن اور تفسیر و حدیث وغیرہ کی کتابوں) کا ترجمہ ایک سے دوسری زبان (جیسے عربی سے اردو) میں کرواتا ہے۔

کوئی پبلشنگ ہاؤس یا مترجم کسی بیرونی مصنف اور اُس کے فن پارے/فن پاروں سے مقامی قارئین کو متعارف کروانے یا معروف کتابوں کے تراجم کی اشاعت سے پیسے کمانے کے لیے اس کی تحریروں کا ترجمہ مقامی زبان میں کرواتا ہے (عالمی سطح پر مشہور کتابوں جیسے کیرن آرم سٹرانگ کی *A History of God*، پاؤلو کولہو کی *The Alchemist*، اور مائیکل ایچ ہارٹ کی *The 100: A Ranking of the Most Influential Persons in History* کے اردو میں کیے گئے تراجم اس کی چند مثالیں ہیں)۔

یہ وہ چند واضح مقاصد ہیں جن کے لیے تراجم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار اور مقاصد ہیں جن کے لیے تراجم کی ضرورت پڑتی ہے۔ مترجم کا فرض یہ ہے کہ اس مقصد کو سمجھے جس کے لیے کسی تحریر کو ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آئی اور ترجمے کے لیے جو حکمتِ عملیاں اپنائے انھیں اس مقصد کے مطابق ڈھالے، بجائے اس کے کہ وہ ایک کتاب اٹھائے، پہلے فقرے سے ترجمے کا آغاز کرے اور خطِ مستقیم میں چلتے ہوئے آخری فقرے تک جا پہنچے۔ اسی طرح سے، ترجمے کے ناقد کو بھی براہ راست ماخذ اور ہدفی متون کے الفاظ و فقرات کے معنوی تقابل میں پڑنے کی بجائے وسعتِ قلبی کا ثبوت دیتے ہوئے اس مقصد (یا مقاصد) کو نظر میں رکھنا چاہیے جس کے حصول کے لیے ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس سے ناقد کو یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ مترجم نے ترجمے کے دوران جو حکمتِ عملیاں اپنائی ہیں ان کی وجہ/اساس کیا ہے۔ اسی طرح سے اس میں یہ حوصلہ پیدا ہوگا کہ اگر مترجم ماخذ متن کے ہر لفظ یا فقرے کا ترجمہ نہ کرنے کے باوجود ترجمہ کیے جانے کے مقصد کو پورا کر لیتا ہے تو وہ اس پر بے جا طنز کے تیر نہ برسائے۔ اس کی مثال کے طور پر ادب کو لے لیتے ہیں۔ بلا شبہہ ادب کا ہر طالب علم، استاد، قلم کار، ناقد، مترجم، وغیرہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ایک ادبی تحریر کا اولین مقصد اظہاریت (expressionism)

ہے،[۱۰] یعنی مصنف کے پیشِ نظر اپنے خیالات، جذبات اور آرا کا اظہار ہوتا ہے (نہ کہ معلومات اور اعداد و شمار کی فراہمی)، چنانچہ ادبی مترجم ترجمے کے دوران اس اظہاریت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اگر اس کوشش میں وہ ماخذ متن میں دی گئی معلومات اور اعداد و شمار سے کسی حد تک صرفِ نظر کر جاتا ہے تو ناقد کو اسے بہت بڑی غلطی سمجھ کر مترجم کو آڑے ہاتھوں نہیں لینا چاہیے (ہاں البتہ اگر وہ معلومات یا اعداد و شمار کسی طرح اسلوب سے وابستہ اور اس پر اثر انداز ہوں تو تب بات الگ ہے)۔ اس کی مثال کے لیے منٹو کے شہرہ آفاق افسانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' سے لیے گئے درج ذیل فقرے اور خالد حسن کی طرف سے کیے گئے اس کے انگریزی ترجمے پر غور کیجیے:

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے انگلی انگلی بڑھتی پندرہ سالوں میں جوان ہو گئی تھی۔

When he was first confined, he had left an infant daughter behind, now a pretty young girl of fifteen.

اس انگریزی ترجمے کی رو سے جب کہانی کا مرکزی کردار بشن سنگھ پندرہ سال پہلے پاگل خانے میں داخل ہوا تو اس کی بیٹی ایک شیر خوار بچی تھی اور اب اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ یہ اضافی معلومات مترجم کے ذہن کی اختراع ہیں، وگرنہ ماخذ متن میں ایسی کسی بات کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ منٹو نے یہ بات قطعاً واضح نہیں کی کہ بچی کی عمر کتنی تھی جب اس کے باپ کو پاگل خانے میں داخل کیا گیا (اس نے محض اتنی معلومات ہمیں دی ہیں، اور وہ بھی بالواسطہ طور پر، کہ وہ اس وقت ایک چھوٹی بچی تھی)۔ اب بجائے اس کے کہ ترجمے میں اپنی طرف سے یہ معلومات شامل کرنے پر ناقد کی طرف سے مترجم کا مذاق اڑایا جائے، ناقد کو یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا اس اضافے سے اس ادبی ترجمے کے مقصد، یعنی اظہاریت، پر ضرب پڑتی ہے یا نہیں، اور اگر نہیں تو معلومات کے اس تھوڑے سے اختلاف سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

۳۔ اوپر بیان کیے گئے دوسرے نکتے میں ہی لسانیاتی تحقیق کی مذکورہ بالا تیسری خامی (یعنی تحقیق و تنقید کا دائرہ متن اور اُس کی لسانیاتی ترکیب تک محدود کرنا) کا حل مضمر ہے۔ تفاعلی تحقیق نے ترجمے کو اُس کے مقصد/ مقاصد سے جوڑ کر غیر لسانیاتی عوامل اور غیر متنی عوامل کے جائزے کا دروازہ وا کیا۔ اس کے علاوہ تفاعلی محققین نے جن دو غیر لسانیاتی یا بیرونی عوامل پر خصوصی زور دیا وہ حسبِ ذیل ہیں:[۱۱]

ماخذ زبان اور ہدفی زبان کی لسانیاتی و ثقافتی اقدار اور روایات

قارئین کی توقعات

چنانچہ مترجم کو چاہیے کہ وہ ترجمہ کرتے ہوئے اس کے مقصد/ مقاصد، قارئین، ماخذ اور ہدفی لسانیاتی و ثقافتی اقدار کو

مدِ نظر رکھے۔ تبھی اُس کا ترجمہ کامیاب تصور کیا جائے گا۔ اسی طرح ناقد کو بھی تنقیدی جائزے کے دوران یہ خیال رکھنا چاہیے کہ کن بیرونی عوامل اور حالات کے تحت مترجم نے ترجمہ کیا ہے۔ اس طرح سے اُس کی تنقید میں جامعیت آئے گی اور اس میں جانبداری کا عنصر کم سے کم ہوگا۔

حرفِ آخر

راقم نے اس تحریر میں لسانیاتی تحقیق کی بنیادی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ہر خامی کے ضمن میں تفاعلی محققین کے پیش کیے گئے حل کا تعارف کروایا ہے۔ یہ اپنے وقت میں ایک انقلابی تحریک تھی لیکن جرمنی سے باہر کی دنیا کو اس کا کماحقہ اندازہ نہ تھا۔ البتہ بعد کے سالوں میں جب جرمن تفاعلی محققین کی کتابوں کے انگریزی میں تراجم کیے گئے تو یورپ کے باقی علاقے بھی اس سے پوری طرح واقف ہوئے۔ اُمید ہے کہ راقم کی یہ اور دیگر تحاریر اس مفید تحقیقی رجحان سے پاکستانی قاری کو روشناس کروانے کا کام کریں گی تاکہ مقامی قاری بھی اس کے ثمرات سے فائدہ اٹھائے اور ترجمے کا مطالعہ، عمل اور تنقید، جدید نظریات و رجحانات کی روشنی میں آگے بڑھے۔

حواشی و حوالہ جات

* پی ایچ ڈی ٹرانسلیشن اسٹڈیز اسکالر، یونی ورسٹی آف لیڈز، ویسٹ یارکشائر، یوکے۔

۱۔ جے سی کیٹفورڈ (J. C. Catford)، *A Linguistic Theory of Translation: An Essay in Applied Linguistics* (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۶۵ء)، ۲۰۔

۲۔ پیٹر نیومارک (Peter Newmark)، *Approaches to Translation* (اوکسفرڈ اور نیویارک: پرگیمن، ۱۹۸۱ء)، ۷۔

۳۔ یوجین نیڈا (Eugene Nida) اور سی آر ٹیبر (C. R. Taber)، *The Theory and Practice of Translation* (لیڈن: ای جے برِل، ۱۹۶۹ء)، ۱۲۔

۴۔ ہمارے ہاں ترجمے کی تنقید کرتے ہوئے اسی روایتی اصول کو اپنایا جاتا ہے کہ ماخذ متن اور ہدفی متن کے الفاظ و فقرات کا تقابل کر کے اُس پر اپنی تنقید کی عمارت کھڑی کی جائے۔ چاہیے یہ کہ ناقد اُن مقاصد، حالات اور مجبوریوں کو بھی مدِ نظر رکھے جن کے تحت ترجمہ کیا گیا۔ اس طرح سے اُس کی تنقید زیادہ جامع، حقیقت کے قریب اور منطقی ہوگی۔

۵۔ تحقیقِ ترجمہ کے مختلف رجحانات اور نظریات کے اجمالی جائزے کے لیے راقم کا مقالہ بعنوان ''نظریاتِ ترجمہ کا اجمالی جائزہ'' (جو فی الحال ایک تحقیقی جریدے میں چھپنے کے لیے جائزے کے عمل سے گذر رہا ہے) ایک مفید تحریر ہے۔

۶۔ کرسٹیانا نارڈ (Christiane Nord)، ''Dealing with Purposes in Intercultural Communication: Some

Methodological Considerations''، مشمولہ *Revista Alicantina de Estudios Ingleses*، ۱۴ (۲۰۰۱ء)، ۱۵۲۔

۷۔ ہدفی متن، ترجمہ شدہ متن کے لیے وہ اصطلاح ہے جسے تفاعلی محققین نے متعارف کروایا، اور جسے شاید تمام ہی تفاعلی محققین متفقہ طور پر استعمال کرتے ہیں۔

۸۔ کلائنٹ سے مُراد وہ شخص یا ادارہ ہے جسے کسی تحریر کے ترجمے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۹۔ کرسٹیانا نارڈ (Christiane Nord)، ''Translating for Communicative Purposes across Cultural Boundaries''، مشمولہ *Journal of Translation Studies*، ۹(۱) (۲۰۰۶ء)، ۴۳۔

۱۰۔ مزید تفصیل کے لیے کیتھرینا رائس کی درج ذیل اہم کتاب کا مطالعہ کیجیے:

کیتھرینا رائس (Katharina Reiss)، *Translation Criticism: Potential and Limitations*، مترجم ای ایف رہوڈز (E. F. Rhodes) (مانچسٹر: سینٹ جیروم اینڈ امریکن بائبل سوسائٹی، ۲۰۰۰ء)۔

حاشیہ ۶ میں حوالہ دیا گیا نارڈ کا آرٹیکل بھی اس بارے میں ایک مفید تحریر ہے۔

۱۱۔ کرسٹیانا نارڈ کی درج ذیل کتاب ترجمے پر اثر انداز ہونے والے مختلف بیرونی عوامل (نارڈ نے ایسے ۸ عوامل پر بحث کی ہے؛ اُن سب کی تفصیل بیان کرنا یہاں ممکن نہیں، اس لیے اُنھیں مستقبل میں کسی اور تحریر کا حصہ بنایا جائے گا) کے مطالعے کے لیے انتہائی اہمیت کی حامل ہے:

کرسٹیانا نارڈ (Christiane Nord)، *Text analysis in Translation: Theory, Methodology, and Didactic Application of a Model for Translation-oriented Text Analysis*، دوسرا ایڈیشن (ایمسٹرڈیم اور نیویارک: روڈوپی، ۲۰۰۵ء)۔

مآخذ

رائس، کیتھرینا (Reiss, Katharina)۔ *Translation Criticism: Potential and Limitations*۔ مترجم رہوڈز، ای ایف (Rhodes, E. F.)۔ مانچسٹر: سینٹ جیروم اینڈ امریکن بائبل سوسائٹی، ۲۰۰۰ء۔

کیٹفورڈ، جے سی (Catford, J. C.)۔ *A Linguistic Theory of Translation: An Essay in Applied Linguistics*۔ اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۶۵ء۔

نارڈ، کرسٹیانا (Nord, Christiane)۔ '' Dealing with Purposes in Intercultural Communication: Some Methodological Considerations''۔ مشمولہ *Revista Alicantina de Estudios Ingleses*، ۱۴ (۲۰۰۱ء)۔

______________۔ ''Translating for Communicative Purposes across Cultural Boundaries''۔ مشمولہ *Journal of Translation Studies*، ۹(۱) (۲۰۰۶ء)۔

______________۔ *Text analysis in Translation: Theory, Methodology, and Didactic Application of a Model for Translation-oriented Text Analysis*۔ دوسرا ایڈیشن۔ ایمسٹرڈیم اور نیویارک: روڈوپی، ۲۰۰۵ء۔

نیڈا، یوجین (Nida, Eugene) اور ٹیبر، سی آر (Taber, C. R.)۔ *The Theory and Practice of Translation*۔ لیڈن: ای جے بِرل، ۱۹۶۹ء۔

نیومارک، پیٹر (Newmark, Peter)۔ *Approaches to Translation*۔ اوکسفرڈ اور نیویارک: پرگیمن، ۱۹۸۱ء۔